طالبان کا افغانستان: بھارت اور کشمیر

افتخار گیلانی

۲۹فروری ۲۰۲۰ءکوقطر کے دارالحکومت دوحہ میں طالبان اور امریکا کے درمیان ہوئے معاہدے سے تقریباً دو ہفتے قبل، بھارتی فضائیہ کا ایک طیارہ کابل ایئرپورٹ پر اُترا۔ اس طیارے میں بھارتی وزیراعظم نریندرا مودی کا ایک دست راست، صدر اشرف غنی کے لیے خصوصی پیغام لے کر گیا تھا، جس نے اسی رات واپس دہلی پہنچ کر وزیراعظم کو مشن کی کامیابی کی اطلاع دے دی۔

امریکا و یورپ سمیت پڑوسی ممالک اور خود افغانستان کی سیاسی جماعتیں توقع کر رہی تھیں کہ طالبان اور امریکا کے درمیان امن معاہدے کے طے ہونے تک افغانستان کا الیکشن کمیشن انتخابات کے نتائج کا اعلان نہیں کرے گا۔ اس کو بھی ایک طرح سے پس پردہ معاملہ فہمی (Deal) کا حصّہ سمجھا جا رہا تھا، تاکہ معاہدے کے بعد افغانستان میں ایک وسیع البنیاد حکومت قائم کرنے میں مدد مل سکے۔ نئی دہلی حکومت کو خدشہ تھا کہ دوحہ معاہدے کے بعد امریکا اور دیگر طاقتیں، یا تو افغانستان میں اَزسرنو انتخابات کروانے پر زور ڈالیں گی یا طالبان کو وسیع البنیاد حکومت میں حصّہ لینے پر آمادہ کروالیں گی۔ لہٰذا، اس کو سبوتاژ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ موجودہ صدر اشرف غنی کو قانونی حیثیت حاصل ہو۔ کیونکہ آثار بتا رہے تھے کہ دوحہ معاہدے کے بعد کابل میں موجودہ حکومت، قانونی حیثیت کے بغیر عضو معطل اور بے معنی وجود بن کر رہ جائے گی۔

اس افسر کے کابل دورہ کے اگلے ہی دن، یعنی ۱۸فروری کو افغانستان کے الیکشن کمیشن نے پانچ ماہ کے بعد انتخابات کا اعلان کر کے اشرف غنی کو بطور صدر کامیاب قرار دے دیا۔ اس طرح ستمبر ۲۰۱۹ءمیں ہوئے انتخابات میں اشرف غنی نے دوسری بار صدر کے عہدے پر قبضہ جما لیا۔

کابل میں سکھ گوردوارے پر بم دھماکا، تشدد کے واقعات اور کابل انتظامیہ کی طرف سے طالبان قیدیوں کی رہائی میں ٹال مٹول کرنے سے امریکا کو پیغام دینے کی کوشش کی گئی کہ افغانستان میں بھارتی مفادات کا خیال رکھے بغیر امن کی بحالی تقریباً ناممکن ہے اور بھارت اس وقت اشرف غنی کی حکومت اور اس کی انٹیلی جنس ایجنسی کے پیچھے پوری یکسوئی سے کھڑا ہے۔

بھارت نے بظاہر افغانستان کے سکیورٹی معاملات سے الگ رہ کر تعمیر و ترقی اور مالی امداد پر توجہ مرکوز کی ہے، تاکہ افغان عوام کی پذیرائی حاصل کر کے طالبان کو اقتدار سے دور رکھا جاسکے۔ ۲۰۰۱ء سے لے کر اب تک بھارت نے افغانستان میں تقریباً تین ارب ڈالر کی رقم صرف کی ہے۔ رواں مالی سال میں بھی بھارتی بجٹ میں افغانستان کے لیے بھارتی چار ارب روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ لہٰذا، یہ تقریباً ناممکن ہے کہ بھارتی ادارے اتنی جلدی کابل حکومت کو طالبان یا کسی بھی پاکستان دوست حکومت کے ہاتھوں میں جاتے دیکھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ جائیں۔

اسی دوران امریکا کے ساتھ طالبان مذاکراتی ٹیم کے سربراہ شیر محمد عباس استانکزئی نے بھارت کے حوالے سے طالبان کی پوزیشن کو ان الفاظ میں واضح کر دیا ہے: ''افغانستان میں بھارت کا کردار ہمیشہ منفی رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ غداروں کی مدد کی، گذشتہ ۴۰ برسوں کے دوران افغانستان کے بدعنوان گروپ کے ساتھ بھارت نے تعلقات قائم رکھے ہیں۔ لیکن اگر بھارت، افغانستان میں مثبت کردار ادا کرنے کو تیار ہو تو افغان طالبان کو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا'' (روزنامہ The News، ۱۸ مئی ۲۰۲۰ء)

ان سبھی ایشوز پر امریکا کو بھی تشویش لاحق ہے۔ اسی لیے اس وقت جب پوری دنیا 'کرونا لاک ڈاؤن' کی زد میں ہے اور بین الاقوامی پروازیں معطل ہیں کہ ایک خصوصی امریکی چارٹرڈ جہاز کے ذریعے صدر ڈونالڈ ٹرمپ کے ایلچی زلمے خلیل زاد، نئی دہلی آن پہنچے۔ جہاں انھوں نے بھارتی وزیر خارجہ سبرامنیم جے شنکر اور سلامتی مشیر اجیت دوبال سے ملاقاتیں کیں۔ بتایا جاتا ہے کہ امریکی ایلچی نے بھارت کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ طالبان کے حوالے سے اپنے رویے میں نرمی لائے اور بتایا کہ ''طالبان کا وجود، افغانستان کی ایک حقیقت ہے۔ ان سے بے زاری اور ان کو زبردستی کابل اقتدار سے دُور رکھنا کوئی دانش مندی نہیں ہے''۔ باوثوق ذرائع کے مطابق خلیل زاد

نے مشورہ دیا کہ ''پڑوسی ممالک روس، چین، ایران اور وسط ایشیائی ممالک کی طرح بھارت بھی طالبان کے ساتھ براہ راست تعلقات استوار کر کے اپنے خدشات براہِ راست ان کی قیادت کے گوش گزار کرے''۔ ایک طرح سے خلیل زاد نے طالبان اور بھارت کے مابین ثالثی اور ان کے درمیان سلسلۂ جنبانی شروع کرنے کی کوشش کی۔ نئی دہلی میں امریکی سفارت خانے نے کثیر الاشاعت روزنامہ دی ہندو کے ساتھ خلیل زاد کے انٹرویو کا بھی بندوبست کیا تھا۔ جس میں انھوں نے طالبان کے ساتھ معاہدے کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ ''موجودہ حالات میں اس کا کوئی متبادل نہیں تھا''۔

بھارت کو خدشہ ہے کہ دوحہ معاہدے کی وجہ سے خطے اور بین الاقوامی برادری میں پاکستان کا وقار بحال ہوا ہے، اور پاکستان کو الگ تھلگ کرنے کی بھارتی کوششوں کو بھاری دھچکا لگا ہے۔

علاوہ ازیں بھارت ہمیشہ افغانستان کے معاملات کو کشمیر میں جاری جدوجہد کے ساتھ منسلک کرتا آیا ہے۔ نئی دہلی میں افسران کہتے ہیں: ''افغانستان میں جب بھی پاکستان کے لیے نرم گوشہ رکھنے والی حکومت مسندِ اقتدار پر آئی ہے، تو کشمیر میں اس کا براہِ راست اثر دیکھنے کو ملا ہے''۔ کشمیر کے ایک سابق گورنر جگ موہن ۱۹۸۹ء میں برپا عوامی بغاوت اور بعد میں عسکری جدوجہد کے آغاز کو افغانستان میں سوویت افواج کی شکست سے منسلک کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء کے درمیان طالبان دورِ حکومت میں کشمیر میں عسکری کارروائیوں میں تیزی آ گئی تھی اور اسی زمانے میں کرگل جنگ بھی برپا ہوئی۔

ان سبھی خدشات کے ساتھ بھارت کی خفیہ ایجنسی 'را' کے سربراہ سامنت گوئل نے ۵ جولائی ۲۰۱۹ء کو وزیراعظم نریندرا مودی سے ملاقات کی اور ان کو مشورہ دیا: ''امریکا- طالبان معاہدے کے ظہور میں آنے سے قبل ہی جموں وکشمیر کے سلسلے میں سخت فیصلہ کرلیا جائے''۔ جس کے ایک ماہ بعد ہی بھارتی پارلیمنٹ نے جموں وکشمیر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نہ صرف اس کی آئینی خصوصی حیثیت ہی ختم کردی، بلکہ ریاست کو ہی تحلیل کر کے اسے مرکزی انتظام والا علاقہ بنا دیا۔ ان ذرائع کے مطابق 'را' کے سربراہ نے یہ دلیل دی تھی کہ ''طالبان کے ساتھ معاہدے کے بعد کشمیر میں حالات کنٹرول سے باہر ہوسکتے ہیں اور اس کے علاوہ امریکا، پاکستان کی اقتصادی اور ملٹری امداد بحال کردے گا''۔ اُن دنوں خیال تھا کہ دوحہ مذاکرات ستمبر ۲۰۱۹ء میں مکمل ہوجائیں گے۔

افغانستان کے حوالے سے نئی دہلی کی بے چینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نئی دہلی میں کچھ بااثر حلقے اب طالبان کے ساتھ براہ راست مذاکرات اور تعلقات استوار کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ مگر افغانستان میں بھارت کے سابق سفیر امر سنہا کے مطابق: ''طالبان کے ساتھ تب تک گفت وشنید کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے، جب تک وہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات کا اَزسرنو جائزہ نہیں لیتے''۔ ان کا کہنا ہے کہ ''طالبان کا جھکاؤ پاکستان کی طرف کافی زیادہ ہے، جس کی وجہ سے بھارت کو ان کے ساتھ کوئی بھی سلسلہ کھولنے میں اندیشے ہیں۔ مزید یہ کہ طالبان کے ساتھ تحفظات اپنی جگہ، مگر جب انٹرا افغان ڈائیلاگ شروع ہوتا ہے، تو بھارت کو اس میں اپنی پوزیشن بنا کر اس کو یقینی کر لینا چاہیے کہ یہ مذاکرات غیر جانب دار جگہ پر ہوں''۔

سابق بھارتی سیکرٹری خارجہ شیام سرن کا کہنا ہے کہ ''بھارتی پالیسی، طالبان کو کلی طور پر کابل اقتدار سے دُور رکھنے اور ایک وسیع البنیاد حکومت میں ان کے اثر ونفوذ کو کم کرنے پر مرکوز ہونی چاہیے۔ یعنی طالبان اگر اقتدار میں شرکت کریں تو بھی ان کی کوئی فیصلہ کن پوزیشن نہ ہو۔ افغانستان میں طالبان مخالف عناصر کو یک جا کر کے یہ ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے''۔ امر سنہا اور شیام سرن کے یہ خیالات بھارتی اسٹیبلشمنٹ کی پالیسی اور اقدامات کا نچوڑ ہیں۔

دوسری طرف دیگر سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ ''۱۹۹۶ء کے برعکس پاکستان اپنے دگرگوں مالی حالات کی وجہ سے متوقع طالبان حکومت کی کوئی بامعنی اقتصادی مدد نہیں کر پائے گا۔ اور یہی کچھ حالات سعودی عرب اور متحدہ امارات کے بھی ہیں۔ اس لیے اپنی مالی پوزیشن پر بھروسا کر کے بھارت کو چاہیے کہ وہ طالبان کو شیشے میں اتار کر انھیں پاکستان کے خیمے سے باہر نکالنے کے جتن کرے''۔

بھارت کی اس سوچ اور حکمت عملی کے نتیجے میں افغانستان میں شاید ہی امن بحال ہو سکے گا۔ چونکہ بھارت خود ہی افغانستان کے معاملات کو کشمیر کے ساتھ منسلک کرتا آیا ہے، اس لیے بین الاقوامی برادری کو بھی باور کرانے کی ضرورت ہے کہ ''اس خطے میں امن وسلامتی تبھی ممکن ہے، جب کشمیر میں بھی سیاسی عمل کا آغاز کر کے اس مسئلے کا بھی کوئی حتمی حل تلاش کیا جائے''۔ اور یہ کہ ''کشمیری عوام کے حقوق کی بحالی اور افغانستان میں ایک حقیقی عوامی نمایندہ حکومت ہی خطے کی سلامتی کی ضامن ہے''۔